نسیم اختر
اسسٹنٹ پروفیسر
بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

پروفیسر ڈاکٹر عطش دُرّانی
ایڈوائزر، این بی ایف، اسلام آباد

اُردو اور جدید سرائیکی افسانے کا مطالعہ: حقیقت نگاری کے تناظر میں

Keeping in view the literay movement of of realism, the objective of this article what to study and analyze the modern Urdu and Saraiki short story. Although realism and short stories are considered contradicting to each other yet the inculcation of realism and objectivity in short stories have been found to be the source of brilliance in them. It has also included the Saraiki short story as a literary genre in the mainstream of fine literature of other languages. This study also proves that apart from the influences of global literary movements on Urdu and Saraiki short stories, the impact of realism as a literary movement has made Urdu and Saraiki short story the counter narrative of world literature.

جدید افسانہ کئی موڑ مڑ کر مثالیت سے حقیقت نگاری کی طرف آیا تو کئی سولات بھی اٹھنے لگے۔ یہ ایک تحریک تھی جو انیسویں صدی میں سامنے آئی۔ یہ صدی اضطراب، افراتفری اور تجسس کی صدی ہے۔ جس میں انسان بے یقینی اور پریشانی کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ادب میں تذبذب کا رویہ کبھی علامت کو اپناتا ہے تو کبھی رومانیت سے اصنافِ ادب کی نوک پلک سنوارتا ہے۔ اس بے چینی کی حالت میں عام انسان بشمول ادیب، شاعر و دانشور نے جب خود کی طرف دیکھا تو گویا وہ حقیقت کی طرف پلٹا۔ ایک عکس حقیقی جس کا وہ خود بھی پرتو تھا اس کے سامنے عیاں ہو گیا۔ پھر اس نے رومانیت کے شوخ رنگوں کو قدرتی رنگوں یا فطرت پسندی (Naturalism) میں ڈھالا، علامت کو لفظ دیئے، ہیولے کو جسامت لکھا تو حقیقت اُبھر کر سامنے آ گئی۔ ایک حقیقی نفسیاتی اثر نے جب کاغذ و قلم کے

ذریعے آشکار کرنا شروع کیا تو حقیقت نگاری کہلانے لگی۔ جس کو آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق اس طرح بیان کیا گیا:

> "A way of seeing, accepting and dealing with situations as they really are without being influenced by your emotions or false hopes. There was a new mood of realism among the leaders at the peace talks.(of novels, paintings, films/movies, etc) the quality of being very like real life the gritty realism of the new drama serial(also Realism) a style in art or literature that shows things and people as they are in real life compare idealism, romanticism."(۱)

حقیقت پسندی جسے انگریزی میں "Realism" کہا گیا ہے دراصل فلسفے کی اصطلاح ہے جو دو نظریات کا مجموعہ ہے۔ ایک یہ کہ مکاں میں مادی اشیاء کا ایک جہاں موجود ہے جو اس بات سے ماورا ہے کہ کوئی ان کے وجود سے باخبر ہے۔ دوسرے لفظوں میں آئیڈیلزم کے برعکس تصوریت۔ جبکہ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ لاوجود اشیاء مکاں میں موجود ہی نہیں۔ آفاقیات کی اپنی ایک دنیا ہے جہاں زمان و مکان کی قید نہیں۔ پہلے نظریے کو ''ادراکی حقیقت پسندی'' یا ''عملیاتی حقیقت پسندی'' کہا گیا۔ دوسرے نظریے کو ''افلاطونی حقیقت پسندی'' یا ''منطقی حقیقت پسندی'' کا نام دیا گیا ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں وجود، لاوجود، اشیا حجم، شکل اور کائنات کی بحث میں الگ الگ خصوصیات کو نظریاتی حوالے سے پرکھا جاتا ہے۔ حقیقت پسندی کی اصطلاح کو جب آرٹ اور ادب کے ساتھ منضبط کیا جاتا ہے تو ہیری لیون کے مطابق یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ''بیرونی اور تاریخی تجربات کے تحت تجرباتی واردات کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہے۔'' دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے جب بات ادب اور مصوری میں حقیقت پسندی کی آتی ہے تو تاثریت جنم لیتی ہے۔ جس میں جمالیت کا تصور ایک بنیادی عنصر کے طور پر اُبھرتا ہے۔ جہاں سے فطرت نگاری ادب اور آرٹ میں راہ پاتی ہے۔ یعنی منطقی اعتبار سے ایک سائنسی اور ارتقائی عمل رواج پا گیا۔ جس سے ادب میں تہہ در تہہ اور پیچیدہ طریقِ تحقیق محدود ہو گیا۔ یہ ایک ایسا روشن پہلو ہے جس نے ادب میں حقیقت پسندی کی اعتباریت کو تقویت دی۔ اس بارے میں تشریحی لغت میں لکھا ہے:

''اس کی بدولت ادب میں انسانی ہمدردی اور جذبات زیادہ عمدگی سے اُبھارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس طرح حقیقت پسندی نے ''جن بھوتوں'' کی کہانیوں کی بجائے ادب کو انسانی حقائق کا رنگ دیا۔ ادیب اب تجربات سے حاصل ہونے والے حقائق کو بیان کرتا ہے۔ اب وہ اپنے مقصد سے مخلص ہے۔ وہ زندگی کو جیسے دیکھتا ہے، بیان کر دیتا ہے۔ اب تک ادب میں اس نئی شکل وصورت کو ادب کا ''بورژوا'' مرحلہ قرار دیا جاتا رہا ہے جو ''تجربیت'' اور ''انفرادیت'' سے عبارت ہے۔ تاہم ادب میں اب سوشلزم اور دیگر حوالوں سے بھی نظریات کا اظہار ہو رہا ہے۔ لیکن بات طے ہے کہ حقیقت پسندی اب ادب کا عنوان بن چکا ہے۔''(۲)

حقیقت پسندی سے مراد مشاہدہ وخیال جو مادے کی پیداوار ہے اور حقیقت سے قریب تر ہے اسے ہو بہو پیش کرنا حقیقت نگاری ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ:

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

۲۔ حقیقت پر مبنی بات کرو۔

۳۔ میں جو بیان کر رہا ہوں وہی حقیقت ہے۔

پہلی مثال میں واضح ہے کہ ''حقیقت'' بمعنی ''سچ'' کے ہیں۔ دوسری مثال میں ''حقیقت'' بمعنی ''مشاہدہ'' کے ہیں کہ جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اسے مِن وعَن بیان کیا جائے۔ جبکہ تیسری مثال میں یعنی بیان کردہ یا تحریر شدہ بات حقیقت سے قریب ترین ہے۔ تاہم یہ معروضی مفاہیم ہیں۔ جن میں حقیقت کا اپنا اپنا جہان ہے۔ مطلق حقیقت کوئی نہیں جانتا مگر انسان اس طرف کوشاں ضرور ہے۔ انگریزی میں اصطلاح Realism بھی ادبی وتحریری صورت میں کچھ اسی طرح کی وضاحت وحقیقت کی غماز ہے:

"If refers generally to any artistic or literary portrayal of life in faithful, accurate manner, unclouded by false ideals, literary conventions, or misplaced aesthetic glorification and beautification of the world. It is a theory or tendency in writing to depict events in human life in a matter of fact, straight forward manner. It is an attempt to reflect life 'as it factually is'."(۳)

تخلیق کار کا جب اپنے اردگرد اور اپنے اندر متنوع رنگوں اور حالات و واقعات سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو اس کا مشاہدہ اور تخلیقی جرأت دو طرح سے کام کرتی ہے۔

۱۔ وہ اپنے مشاہدے اور تخلیقی جرأت کو یکجا استعمال میں لاتے ہوئے تحریری تخلیقی جبلت کے تحت کوئی مثبت چیز سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے اسے حقیقت نگاری کا سہارا لیتے ہوئے ادبی انداز میں پیش کرتا ہے۔ جس میں اس کی ذات، عصر، مشاہدہ شامل ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت میں تخلیق کار فنی عناصر کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تخیلی پرواز کرتا ہے اور فن کی جمالیات کو نظر انداز کیے بغیر ایک ایسا تخلیقی ادب پارہ مرتب کرتا ہے جس کے سحر میں ادیب و قاری بہت دیر تک اَسیر رہ سکتے ہیں۔ ایسے ادب پارے کے لیے ضروری نہیں کہ مشاہدہ حقیقت کا عکاس ہو۔ اس میں مشاہدہ تخیل و جمالیات سے مزئین ایسی تحریر کو وجود میں لاتا ہے جس میں مافوق الفطرت ترتیب بھی بے معنی نہیں لگتی مگر اسے حقیقت نگاری کی تقلید نہیں کہیں گے۔ کیونکہ حقیقت نگاری بارے یہ واضح ہے:

''حقیقت نگاری کے معنی ادب یا فکشن میں حقائق کو اس طرح پیش کرنے کے ہیں جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہوتے ہیں، خواہ وہ حقائق ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہوں۔''(۴)

اُردو اور سرائیکی فکشن میں اس کی کئی ایک امثال موجود ہیں۔ سرائیکی افسانے میں غلام حسن حیدرانی کا افسانہ ''پیئو یا بھرا'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کا موضوع چنداں خوشگوار نہیں ہے۔ ایک ایسی معاشرتی برائی کا تذکرہ کیا گیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ جس کے اختیار کرنے پر کئی نسلیں تباہ ہوسکتی ہیں۔ اس کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ صابو کا خاوند قادرا جب فوت ہوتا ہے تو اُن کی بیٹی جندن ابھی آٹھ نو سال کی تھی۔ دونوں کا ایک دوسرے کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ مگر ان کی جائیداد میں تین گھر تھے۔ ہمسائیگی میں موجود جبار اور عزت جن کا ایک بیٹا اقبال تھا۔ اس کے لیے جندن کا رشتہ مانگ لیا تا کہ جائیداد ان کے پاس چلی جائے۔ بات پکی ہوئی تو کچھ عرصہ بعد عزت فوت ہوگئی۔ باپ بیٹا اکیلے ہو گئے۔ وقت و حالات کے پیشِ نظر صابو نے جبار سے شادی کر لی اور اقبال کی شادی اس کی

بیٹی جندن سے ہوگئی۔ ایک رات جبار پر شیطان غالب آ گیا اور جندن اور جبار کا ایک غیر اخلاقی و غیر فطری رشتہ بنا جو مزید استوار ہوا تو جبار نے صابو کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔

''ہک سال بعد جبار صابو کوں طلاق ڈے کے گھروں کڈھ ڈتا۔ ایں کیوں نہ کرے ہا۔ بُرائی دا بوہا جو کھُل پیا ہا۔ ٹھیک اے، چنگا کیتا نہیں۔ ماس ہوندیں چھچھڑے کون پٹے۔ صابو کئی مُد رُلدی دھی دے احسان دے پھٹ چٹیدی مرکھپ گئی۔ جندن وی اپنی بھل منسائی توڑ پچائی جو مادا مُنہ ڈیکھن نہ لنگھ گئی۔ ٹھیک تاں کیتا ہس۔ پیہاج دامنہ کیوں ونج ڈیکھے ہا۔''(۵)

مگر اس المیے کے بعد ایک اور المیہ ردِعمل میں پرورش پاتا ہے۔ جندن اپنے بیٹے اکبر کی دھوم دھام سے شادی کرتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا خاوند اقبال اپنی بہو کے ساتھ تعلقات کی انتہا تک پہنچ چکا ہے تو وہ بہت روتی ہے اور اپنی سہیلی کو بتاتی ہے۔ یہ بات اس کا بیٹا اکبر سن لیتا ہے اور اگلے دن اپنے باپ اقبال اور اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ اس اَخیر پر مصنف نے ایک جملہ سوالیہ ثبت کر دیا ہے کہ: **اے گالھ تاں جندن ای جاݨدی اے جو مقتول قاتل دا سگا پیو ہا یا بھرا۔''**

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر رشتوں کی بنیاد غیر حقیقی ہو تو ان کا انجام بھی توقعات کے برعکس ہوتا ہے۔ اس معاشرتی تلخ حقیقت کو آشکار کرنے میں جس مہارت سے یہ پلاٹ بُنا گیا اتنا ہی نوکیلا قلم بھی استعمال کیا گیا۔ اس افسانے میں اُردو افسانہ نویس منٹو کا عکس نظر آتا ہے۔ ۷۰ کی دہائی میں کسی معاشرتی جنسی برائی کو اس جرأت مندی سے سرائیکی افسانے میں بیان کرنا بہت بڑی دلیری ہے۔ اس طرح کا موضوع حقیقت پسندانہ انداز میں سرائیکی افسانوی ادب میں ابھی پیش نہیں ہوا۔ یہ بین وہی بات ہے جو کبھی منٹو کے بارے میں کہی گئی کہ: ''منٹو ایسے سلگتے ہوئے موضوعات پر ہاتھ ڈالتا جن سے دوسرے ادیب دامن بچا کر گزر جانے میں ہی عافیت خیال کرتے تھے۔ اس نے اپنے عہد کے ظلم اور جبر کو برہنا کر کے رکھ دیا۔ ایسا جبر جو ہر بار دولت کا سہارا لے کر نئے کپڑوں میں سج کر پھر سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ منٹو نے اُس کے لباس کو اپنے لفظوں کے نشتر سے ہمیشہ کے لیے ایسا تار تار کیا کہ پھر ہر کسی کو اُسے پہچاننے میں آسانی ہوگئی ہے۔''(۶)

جس موضوع کو سادگی اور تہہ داری میں غلام حسن حیدرانی نے افسانے میں بیان کیا ہے اسی موضوع کو **بانو قدسیہ** نے ناول جیسی صنف میں بعنوان **''راجا گدھ''** بڑی وضاحت کے ساتھ انجام تک پہنچایا ہے۔ جس میں حرام کاری کے نتائج میں پنپنے والے نفسیاتی مسائل اور معاشرتی حساسیت کی حقیقت کا پردہ چاک کر کے ناول کو مقصدیت کے قریب کر دیا گیا ہے۔

دراصل ادب میں حقیقت نگاری کی بنیادیں بہت تنومند ہیں کیونکہ جس تخلیقی ادب کا تعلق زندگی سے ہو وہ زندہ لوگوں میں تحریک کا باعث بنتا ہے۔ ایسی تحریک جو قاری کے لیے زندگی کو سمجھنے اس کی قدروں کو پہچاننے میں سہولت فراہم کرتی ہے۔ ادب میں حیاتی کی عکاسی اگر سوجھ بوجھ کے ساتھ مشاہدے کو عیاں کرے تو وہ قاری کا بہت عمدہ کیتھارسس کرتی ہے اور ایسا Relief قاری میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور ادب کی اعتباریت کو فروغ دیتا ہے۔ کیونکہ جو ادب تاریخی جاذبیت اور جمالیات حسن کے متوازی تعقل کی بات کرے وہ زمانہ حال کا بہت بڑا گواہ وعلمبردار ہے۔ جو انسان کو وقت میں جینے اور وقت کے ساتھ جینے کی ویڈیو دکھاتا ہے۔

تخلیقی ادب میں رومانوی عنصر کے مقابلے میں حقیقت نگاری جہاں ادبی وقار کو بلند کرتا ہے وہاں ادب کی نئی راہیں بھی متعین کرتا ہے جیسا کہ حقیقت پسندی کا اعلان کرتے ہوئے پریم چند نے کہا تھا:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سُلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''(۷)

پریم چند نے ادبی جاذبیت، ادبی جمالیت، زبان کے عناصر اور حقیقت پسندی کو یکجا کرتے ہوئے تحریر میں مقصدیت کو اوّلیت دی ہے۔ جس میں مصنفین کے لیے اور ان کی ادبی تخلیق کو پرکھنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کر دی ہے، مگر حقیقت نگاری پر بات کرتے ہوئے اشتیاق احمد لکھتے ہیں:

> ''ہر تخلیق کار کا زندگی اور اس زندگی سے وابستہ متنوع مظاہر اور ہمہ رنگ پہلوؤں کو دیکھنے اور اسے ادب میں پیش کرنے کا اپنا انداز ہے۔ ادیب جہاں اپنے باطنی تخیلات کو عزیز رکھتا ہے

وہاں وہ اپنے عصر کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ یوں ایک فن پارے میں مصنف کی ذات اور اس کا عہد دونوں کارفرما ہوتے ہیں۔ اس تخلیقی کارفرمائی میں فنی عناصر کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔فن کی جمالیات کو نظر انداز کر کے فنکار تا دیر سالم رہنے والی تخلیقات پیش نہیں کرسکتا۔ ادیب اظہار کے جن ذرائع کو استعمال کرتا ہے، اُن میں ایک ذریعہ حقیقت نگاری کا ہے۔‘‘(۸)

سرائیکی افسانے میں حقیقت نگاری کے زمرے میں مطالعہ کیا جائے تو عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ جب سرائیکی ادیب، قلم اور معاشرہ وافسانہ میں باہمی شناسائی کا رشتہ قائم ہوا تو سرائیکی افسانے کو بے حد تل وطنی یعنی اپنے زمینی حقیقی موضوعات ملے۔ مثلاً سرائیکی کہانی اگر پہلے اساطیری حوالوں پر مبنی تھی تو اب کہانی سے افسانے تک کے سفر کے بعد سرائیکی افسانے میں حقیقی موضوعات بھوک، افلاس، بیماری، بیکاری، جہالت، توہم پرستی، زندگی کی بنیادی اقدار اور صداقتیں، آدرش ومقصدیت، فن کی آبیاری، مشرقی تہذیب کا احیاء، اپنی زمین وسیب اور ماحول کی خوشبو، بچوں اور عورتوں کے مسائل وغیرہ شامل ہو گئے۔

بنیادی اقدار، وسیب اور آدرش کی بات کریں تو جمشید احمد کمتر کا افسانہ ’’چماٹ‘‘ بمعنی تھپڑ بطور حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کی مختصر کہانی کچھ یوں ہے کہ نواب اسد خان کی بیٹی شبنم عرف شبو بچپن میں گم ہو جاتی ہے۔ وہ اُسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ صدمہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا چھوٹا بیٹا نواب عظمت خان اور بیوی اکیلے رہ جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد نواب عظمت کی ماں بھی مر جاتی ہے۔ وقت نے گھاؤ بھر دیے۔ نواب عظمت بڑا ہوا۔ سوائے ایک نوکر کے باقی سب کو نکال دیا۔ اب شراب نوشی کرنا اور کوٹھے پر جانا اس کا معمول بن گیا۔ نوکر کے سمجھانے پر اسے نکالنے کی دھمکی دیتا۔ ایک شام جب کوٹھے پر گیا تو بوڑھے سے پوچھا جو پہلے ہی اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا:

’’شیریں کتھ ہے؟‘‘

بڈھڑے آکھیا۔ ’’او رَتو کی اِتھوں نکل گئی ہے۔ تے فجر اُوندی لاش ریل دی لائن توں ملی ہے۔

اَتے وینڈی وار تُہاڈے ناں اوا ے خط ڈِ ے ݙِتی ہے۔ پڑھڑے خط ڈِ تا۔ نواب عظمت اُونکوں کھول تے پڑھیا تاں لکھیا ہویا ہا! ''نواب صاحب! میکوں ہُݨ پتہ لگے جو تُساں نواب اسد دے صاحبزادے ہیوے، تے تہاکوں وی اے جاݨ تے ڈُکھ تھیسی جو میں نواب اسد دی دھی شبنم عرف شبو ہاں......''

نواب عظمت کوں اے لفظ ہتھوڑے وانگ لگے۔ وقت دی چماٹ عیاش نواب دا ساہ کڈھ گِدّھا۔ لکھے بعد ڈِ ولا شاں نواب اسد دے بنگلے تے پُج ڳیاں۔''(۹)

اردو ادب میں بھی طوائف ایک عرصہ تک موضوع رہا اور جس میں دبستانِ لکھنوٗ اپنی الگ موضوع اور طرز کی بنا پر ایک عرصہ تک اردو ادب میں پنپتا رہا۔ جس نے اردو ادب کو ''ایک موضوع مگر کئی رنگ'' دیے۔ جیسے مرزا ہادی رسوا کا ناول **''امراؤ جان ادا''** جسے پورے برصغیر میں پذیرائی ملی۔ اس پر فلمیں بنائی گئیں، ڈرامے بنائے گئے۔ اس کے بعد لکھنویت ایک الگ دبستانِ اردو ادب کی صورت بہت دیر تک قائم رہا۔ مگر جب ترقی پسند تحریک کی ہوا چلی تو اردو ادب کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی اور ادب میں مقصدیت دَر آئی۔ جب یہ مقصدیت سرائیکی ادب کا خاصا بنی تو حقیقت پسندی اُبھر کر سامنے آئی۔ متذکرہ بالا سرائیکی افسانے میں جس تلخ حقیقت کا اظہار ملتا ہے اس کی مثال سرائیکی افسانوی ادب میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ نواب عظمت خان کو زندگی اور حالات کی اس قدر سنگین چپیڑ پڑتی ہے کہ وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ افسانے کا آخیر قاری کے دل میں ذرا برابر ہمدردی پیدا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت تلخ سہی مگر وہ تسلیم کی جاتی ہے۔

اس افسانے میں حقیقت پسندی کا عنصر مقصدیت سے جنم لے رہا ہے۔ جس میں معاشرے میں پھیلی ان برائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کو کرتے وقت انسان اپنے اور پرائے کا فرق کرنا بھول جاتا ہے اور سچائی یا حقیقت جب سامنے آتی ہے تو فاعل کہیں دور چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض اوقات مختلف موضوعاتی رجحان ایک دوسرے کو over lap کرتے ہیں۔ مثلاً رومانویت میں حقیقت نگاری یا علامت کے ساتھ مقصدیت یا تانیثیت کے ساتھ مقصدیت اور ساتھ ہی حقیقت

نگاری کا پلڑا بھاری ہو جائے تو پھر وہ تانیثیت سے زیادہ حقیقت پسندی کا رجحان شمار ہوگا مثلاً ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والا محمد عالم شاہ جتوئی کا افسانہ **''ڈساؤ میکوں''** (مجھے بتاؤ) ایک سوالیہ عنوان ہے جس میں ایک جھنجھلاہٹ ہے۔ سوال سے کہیں زیادہ اضطراب ہے۔ ایک ایسا اضطراب جو بار بار کسی حقیقت کو جھٹلانے پر جنم لیتا ہے۔ یہ معاشرتی ردعمل بھی ہوسکتا ہے۔ یہ ذات کا کتھارسس بھی ہوسکتا ہے اور رشتوں کی سفاکیت کا ردعمل بھی ہوسکتا ہے۔ کسی بھی صورتِ حال میں کسی ایسی حقیقت کا ردِعمل ہے جو عام حالات میں قابلِ قبول نہ ہو یا پھر جس کی مذہب، رواج، روایت، اخلاقیت اجازت نہ دیتے ہوں۔ ''ڈساؤ میکوں'' اخلاقیات ایک کرداری افسانہ ہے، جس میں کندن مرکزی کردار ہے۔ فنی لحاظ سے اس کا پلاٹ مضبوط ہے۔

کندن اس وقت بیوہ ہو جاتی ہے جب اس کا بیٹا اصغر آٹھ سال کا تھا۔ ہنرمند نہ تھی۔ اپنی اور بیٹے کی زندگی بچانے کے کی خاطر لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرنا شروع کیا۔ جب اصغر پندرہ سال کا ہوا تو چھٹی کلاس میں پہنچا۔ داخلے کے لیے گیا تو اخراجات سُن کر نا امید ہو گیا۔

> ''اصغر دی عمر پندرہ سال تھی گئی ہئی تے چھیویں جماعت وچ داخل تھیون گیا پر کتاباں، داخلہ تے فیس دا خرچ سن کر اہیں او واپس گھر وَل آیا۔ اتناں بار اوندی ماء کتھاں سہہ سگدی ہئی۔ اوندے واسطے تاں روٹی صرف روٹی کٹھی کرن ہک ہوں مشکل کم ہا۔ اصغر پڑھائی چھوڑ تے ہک زمیندار کول ۳۰ روپے تنخواہ تے نوکر کھڑ تھیا ایویں کجھ سال ہئے ٹپ گئے۔'' (۱۰)

کندن نے کچھ عرصہ بعد بیٹے کی شادی بارے سوچنا شروع کیا۔ رشتے کے لیے دعائیں کرتی اور کرواتی۔ آخر اس کی ہمسائی شرم نے اپنی بیٹی شمّی کا رشتہ دیا۔ شمّی خوبصورت نہ تھی اور اس کی آنکھ میں بھی داغ تھا۔ شادی کے بعد مہینہ بھر وہ پلنگ سے نہ اُتری۔ کندن نے جب کام کاج کرنے کی بات کی تو روٹھ کر ماں کے گھر چلی گئی۔ جب اصغر منانے گیا تو اس کی ساس نے کہا:

> ''اصغر اساں تیڈی ماں کوں ہوں شریف سمجھے ہاسے۔ پر ہن او آہدی ہے جیویں میں نوکرانی بنی ودی آں شمّی وی اینویں نوکرانی بنے۔ اساں تیڈے نال شادی کر ڈتی ہائی۔ ہیں سانگیں کیتی ہائی

جو او نوکرانْی بنْسی ۔ اساں کیھڑا وڈہ گدھی پیٹھوں ۔ اے اساں کنوں ہرگز نی تھی سگدا۔ تے نہ اساں اے کریسوں۔'' (۱۱)

وہ اصغر کے ساتھ طے کرتے ہیں کہ وہ ماں کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دے۔ اصغر گھر واپس آ کر ایسا ہی کرتا ہے۔ اُسے بالوں سے پکڑ کر باہر نکال دیا اور اس صدمے سے صغریٰ پاگل ہوگئی۔

اس افسانے کا عروج بہت جاندار ہے جس میں سرائیکی کی یہ کہاوت غالب آتی ہے:

''ڈٹھی چٹی چمڑی تے بھُلی اَمڑی'' (سفید رنگ دیکھ کر ماں بھول گئی)

نئے رشتوں کی کشش کس طرح انسان کو اپنے دائمی رشتوں کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگرچہ یہ اس افسانے کا موضوع ہے مگر افسانے کے آغاز میں دکھایا گیا ہے کہ کندن اور پھر اصغر کو حالاتِ زندگی حقیقت پسند بنا دیتے ہیں۔ اگر کندن کے پاس روٹی روزی کا وسیلہ نہیں تو لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کے بارے میں جا کر پوچھتی ہے۔ چھوٹے موٹے کام کاج کرنے کو عار نہیں سمجھتی۔ ماں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اصغر جب یہ دیکھتا کہ آگے تعلیم حاصل کرنا ان کے بس کی بات نہیں تو وہ زمیندار کے پاس نوکری کر لیتا ہے۔

لیکن ایک حقیقت پسند انسان کس طرح غیر حقیقی انداز میں ماں کے رشتے کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ جس ماں نے اصغر کو دَر دَر دھکے کھانے سے بچانے کی خاطر دَر دَر جا کر نوکری کی، اُسی نے اُسے بے گھر اور بے امان ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو مکمل یتیم بنا لیا۔ مگر کندن باقی تمام زندگی کے لیے اپنے لیے اور جگ والوں کے لیے سوالیہ نشان بن گئی۔ رشتوں کے تقدس کی پائمالی کا نوحہ کندن اس طرح کرتی ہے:

''اے سوچیندیں اوندا دماغ پھِر گیا تے او والیں وچ مٹی سَٹ کراہیں بازار ڈُوں بھج پئی۔ ہِک ہِک ڈُوں ڈیکھ تے آکھے ڈساؤ میکوں! ڈساؤ میکوں! ڈساؤ میکوں! لوگ مذاق کرنْ۔ نلی کنوں پکڑ تے پُچھن کیا ڈساؤں؟ کندن ہِک لمبا سادہ بھرتے آکھے۔ جتھاں میں جمی ہم او گھر میڈے پیوء دا ہا۔ جتھاں میں پرنیج گئی ہم او گھر میڈے پئے دا ہا۔ او مر گئے۔ پئے دا گھر ہنْ میڈے

پُتر دا گھر ہے۔ڈ ساؤ میڈا گھر کتھاں ہے۔ڈ ساؤ میڈا گھر کتھاں ہے؟(۱۲)

اگر چہ آخر میں یہ افسانہ تانیثیت (Feminism) کے رجحان کا غماز لگتا ہے مگر افسانہ نویس کی حقیقت پسندی زیادہ نُشابر (اجاگر) ہوتی ہے۔حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والے سلوک اور اس کی حقیقت(ownership) اور خود مختاری کو چیلنج کرتی ہے۔ المیہ پھر وہی سامنے آتا ہے کہ والدین ساری زندگی بچوں کو پالنے، تربیت کرنے اور اُن کی خوشیوں کے لیے محنت مشقت کرتے گزار دیتے ہیں مگر اولاد والدین کے بڑھاپے میں انھیں اپنے پاس رکھنے کی بھی روادار نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی وسیبی حقیقت ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔

مصنف کو اس سماجی حقیقت کا گہرا شعور اور ادراک ہے مگر تانیثیت اس کے پسِ منظر سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔مصنف نے اس افسانے میں تانیثیت اور سماجی حقیقت کو اس طرح سمو دیا ہے کہ دونوں حقیقتیں یکساں دکھائی دینے لگتی ہیں۔مگر اس میں سماجی حقیقت کا پلڑا بھاری ہے۔سماجی حقیقت نگاری بارے ڈاکٹر آنسہ لکھتی ہیں:

> ''سماجی حقیقت نگاری کا نظریہ معاشی برابری اور سماجی بیداری کا علمبردار ہے جو حقیقتاً داستانوی طرز اور رومانوی رجحانات کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ اس نے افسانوی ادب کو خیال خواب کی مصنوعی اور کھوکھلی کائنات سے نکال کر حقائق کی سنگلاخ دنیا سے منسلک کر دیا ہے..... وقت کی نبض کو ٹٹولتے ہوئے وقت کی رفتار کا ساتھ دیا ہے۔سماجی شعور کو بیدار اور مظلوم و بے بس لوگوں کو منظّم کیا ہے۔سماجی حقیقت نگاری نے سماجی انتشار، اخلاقی گراوٹ، تہذیبی استحصال اور طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والے مسائل کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر نہ صرف معاشرے کی مسخ ہوتی ہوئی تصویر کا پختہ نقشہ پیش کیا بلکہ اس کو سنوارنے کا بھی جتن کیا۔''(۱۳)

لفظ 'افسانہ' اور 'حقیقت' بظاہر تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جبکہ اس مطالعے میں خیالی کہانی میں حقیقت کا ادراک یا پیش کش دلچسپ تہ در تہ معنوں میں پوشیدہ ہے۔لیکن خیال حقیقت کا آغاز بھی ہے۔شاید پہلے خیال کی تلاش بھی حقیقت ہے مگر ادب میں عام طور پر خیال کی عملی حقیقت ہی اس فلاسفی

میں اہم سمجھی جاتی ہے۔ دوسری طرف اگر افسانے کی معنوی کیفیت کو بغائر مطالعہ کیا جائے تو افسانہ..... کتھا، کہانی، نِکی کہانی یا خیالی کہانی جو کرداروں کے ذریعے جذبات و تاثرات کا ایک ایسا تال میل ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ افسانہ خیالی کہانی ہوسکتی ہے مگر خیال کو جنم دینے والی بھی حقیقت ہے اور اسے ادب کا حصہ بنانے والا ادیب بھی حقیقت ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ خیالی کہانی میں حقیقت کا مطالعہ متضاد کیفیت کا حامل نہیں فلسفانہ ہے۔ اس سلسلے میں وقار عظیم اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''حقیقت اور افسانے کے سیدھے سادھے لفظ بھی اس نوعیت کے ہیں کہ ان دونوں لفظوں کو ہم کبھی کبھی نہیں اکثر استعمال کرتے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت ہمارے لیے عالمِ مشاہدات اور افسانہ عالمِ دنیا کی تصویر ہے۔ جسے کوئی جھٹلا نہ سکے وہ حقیقت ہے۔ جس میں شک کا شائبہ بھی نہ ہو وہ افسانہ۔ لیکن ان دو مانوس لفظوں کے ظاہری پیکر سے گزر کر ان کی معنوی تہوں میں گزر ہوتا ہے تو بات اتنی سیدھی سادی اور معمولی نہیں رہتی جیسی کہ نظر آتی ہے۔''(۱۴)

حقیقت اگر ہو بہو جیسی وہ ہے، مگر یہاں ظاہری مُراد لی جاتی ہے۔ وہ حقیقت دراصل نقل ہے کسی اور اصل کی۔ شاید جو گزر چکا ہے یا پھر وہ کہیں اور موجود ہے۔ لیکن حقیقت ظاہری احوال کے علاوہ کوئی سوچ بھی ہوسکتی ہے۔ کسی خوشگوار ذہنیت کا اظہار یا پھر زنگ آلود ذہنیت کا انکشاف، جذبۂ محبت و نفرت یا پھر ذہنی حساسیت کا اظہار۔ یہ سب افسانے میں اشاروں کنایوں میں بھی ہوسکتا ہے اور انقلابی صورت میں یا بابانگِ دہل بھی۔ مگر افسانہ فنی لحاظ سے اپنے دائرے میں رہے گا اور حقیقت کا رجحان اس کے موضوع میں تقویت اور افسانوی سطح طے کرے گا۔

حساس ذہنی کیفیت اور معاشرتی ناہمواری کا اظہار سید حفیظ اللہ گیلانی کے سرائیکی افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ جس میں انھوں نے زندگی کی دشوار گزار راہوں کے سنگِ میل گنوائے ہیں کہ ایک سنگِ میل جو سفر کی کمی کا نشان اور سفر کی دوری کا پتہ دیتا ہے مگر ایک سنگِ میل سے دوسرے سنگِ میل کے

درمیان انسان کو کس کس دشواری اور کشت سے گزرنا پڑتا ہے کہ بچے چھوٹی عمر میں بزرگ ہو جاتے ہیں اور پریشانیاں بڑی عمر کے لوگوں کو پیچھے دھکیل کر ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتی ہیں۔ اس سلسلے کا ایک مختصر افسانہ ''سکینہ'' ہے۔ یہ دراصل احساس کا مرقع ہے جس کا کردار سکینہ چھ سالہ بچی ہے۔ اس کے والدین کے علاوہ اس سے چھوٹے تین بھائی ہیں۔ اس کا چچا اپنی ماں کے کہنے پر کئی میل کا فاصلہ طے کر کے شہر سے کچھی کے علاقے میں آتا ہے۔ وہاں سارے بچے اسے گھر سے باہر مل جاتے ہیں۔ سکینہ چچا سے پیار لینے کے بعد گھر بھاگ جاتی ہے۔ گھر میں وہ سارا وقت کمرے میں چھپی رہتی ہے۔ اس پر ماں اس کی پٹائی کر دیتی ہے مگر پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ:

''ہس ویرݨ اینہ ایندا ایہوسنٹپ ایندا روگ بݨ گئے تہا کوں مِل کے اے بھجدی بھجدی اندر آئی تے سیدھا اَٹے آلے گلاترے توں چاپر ہٹا کے ڈِٹھا تاں اَٹے دی چونڈھی گھر اچ کوئنا ہئی ہس خالی گلاترے دی ٹیک لگ کے رووݨ بہہ گئی۔ آکھݨ لگی ''اماں ساڈا مزمان آ گئے تے اَٹا وی کوئینی'' میڈے سمجھاوݨ تے اے چپ نہ تھئی تاں میں ڈو وں چار ہتھ.....'' (۱۵)

یہی تلخ حقیقت بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم، کشور ناہید کی تحریروں کا انفرادی امتیاز ہے اور سرائیکی میں مسرت کلانچوی، احسن واگھا اور حفیظ خان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ افسانے کے ذریعے حقیقت کا اظہار انفرادی مقصدیت کو عیاں کرتا ہے جو کسی بھی ادیب کی مثبت سوچ کا اظہار یہ ہے۔ سرائیکی جدید افسانے پر جہاں حقیقت نگاری و ترقی پسند تحریک کے اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے وہاں وسیبی و ثقافتی حقیقتوں کا بیان بھی قابل تحسین ہے۔ کیونکہ اب کہانی کار تخیل، مشاہدے اور شعور کو بروئے کار لا کر تصنیف کو تخلیق کرتا ہے۔ اس مختصر سے مطالعے سے عیاں ہے کے سرائیکی افسانے میں حقیقت نگاری نے اپنی جڑیں پکڑ لی ہیں اور مشاہداتی حقائق کو زیادہ سے زیادہ ادبی رنگ دینے کی روایت آگے بڑھ رہی ہے۔

حوالہ جات

1. http://www.**oxforddictionary.com**/difinition Learner/realism

۲۔ محمد اکرام چغتائی و دیگر، **تشریحی لغت**، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ص ص: ۴۴۴، ۴۴۵

3. https://web.cn.edu/kwheller/Lit_terms_R.html

۴۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، **اردو ادب کی تحریکات اور تنقیدی نظریات**، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۲۰

۵۔ غلام حسن حیدرانی، **غلام حسن حیدرانی دے افسانے**، تلاش و مرتب: مہر گل محمد، ملتان: مجلسِ ایوان تعلیم، اپریل ۱۹۹۴ء، ص: ۱۱۹

۶۔ شہزاد فراموش، **منٹو ایک حقیقت پسند افسانہ نگار**، روز نامہ خبریں، ملتان: ۱۲ جنوری ۲۰۱۷ء

۷۔ سردار جعفری، **ترقی پسند ادب**، لاہور: مکتبہ پاکستان، س ن، ص: ۱۳۶

۸۔ اشتیاق احمد، **حقیقت نگاری**، مشمولہ: **ماہِ نو**، جلد نمبر ۵۴، شمارہ نمبر ۳، لاہور: ادارۂ مطبوعات پاکستان، مارچ ۲۰۰۱ء، ص: ۲۸

۹۔ جمشید احمد کمتر رسولپوری، **چماٹ**، مشمولہ: ماہنامہ ''**سرائیکی ادب**''، شمارہ نمبر ۳، ملتان: مارچ ۱۹۷۵ء، ص: ۳۴

۱۰۔ محمد عالم شاہ جتوئی، **ڈساؤ میکوں**، مشمولہ: ماہنامہ **سرائیکی ادب**، شمارہ نمبر ۱۱، ملتان: نومبر ۱۹۷۵ء، ص: ۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۸

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۹

۱۳۔ آنسہ احمد سعید، ڈاکٹر، **کرشن چندر کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**، اسلام آباد: ادارۂ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص: ۸۷

۱۴۔ وقار عظیم، **فن افسانہ نگاری**، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۹۲

۱۵۔ حفیظ اللہ گیلانی، سید، **اَن رادھ**، ڈیرہ اسماعیل خان: ھپت سندھو پبلی کیشنز، فروری ۲۰۱۶ء، ص: ۸۷